اورنگزیب یوسفزئی اپریل 2014

تبصرہ بر کتاب "منکرینِ صلوٰۃ پر دہریت کے اثرات "

[فتنہ انکارِ صلوٰۃ نمبر]

تمہید

کتاب زیر نظر اس عاجز کو برائے تبصرہ ارسال کی گئی ہے۔ کثیر الجہت علوم کی جھلکیوں سے معمور ہے جس سے مرتب و مصنف کا وسیع علمی تناظر منعکس ہوتا ہے۔ یہ عاجز اپنی محدود دسترس اور کوتاہ فہمی کے باعث خود کو گومگو کی کیفیت میں پاتا ہے کہ کیا واقعی ان گوناگوں موضوعات پر انسانی منفعت کے مقصدِ واحد کے تحت کچھ لکھ بھی پائے گا یا نہیں۔ تاہم شروعات کے لیے سرِورق سے ابتدا کرنے کی جسارت کرتا ہوں اس تاثر کے ساتھ کہ کتاب کا ٹائٹل کچھ اس انداز میں تحریر فرمایا گیا ہے جو خاصا چونکا دینے والا اور فتنہ انگیز ہے، یعنی،،،،،، "**منکرینِ صلوٰۃ پر دہریت کے اثرات** [فتنۂ انکارِ صلوٰۃ نمبر]"۔۔۔۔ پہلی نظر میں ہی آپ زبانِ طعن اور جنونِ فتویٰ گیری کو بآسانی بھانپ لیں گے۔ دل غم واندوہ سے بھر گیا۔ ایک عالم وفاضل بھائی سے اس پُر تشدد اندازِ تحریر کی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ ناچار زبان پر یہ گریہ جاری ہو گیا:

واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی — برقِ طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی — فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

قلم کار، جن کا نامِ نامی جناب ظفر اقبال خان لکھا گیا ہے اور جن کا تعلق کسی "ادارہِ اسلامیہ، حویلی بہادر شاہ، جھنگ" سے بتایا گیا ہے، ماشاءاللہ اپنی کتاب کے سنگین نوعیت کے عنوان ہی کی نسبت سے اقبال[ر] کے اس مصرعے کی مجسم تصویر نظر آتے ہیں کہ: "**دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد**"۔ خدا جانے ہم لوگ مسلمان ہونے کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے باوجود اپنے رویوں میں پُر امن کیوں نہیں ہیں۔ جب کہ اسلام کا معنی ہی امن وسلامتی ہے۔ متن کا بیشتر حصہ راست بازی پر اجارہ داری کا غماض ہے اور خویش پرستی کی علت کا ترجمان ہے۔ آج کل کی جدید سائنسی دنیا میں جہاں ہر لمحے علمی دنیا میں نت نئے انکشافات کا میلہ لگا ہوا ہے، اور خود کو عقلِ کل سمجھنے کا تصور متفقہ طور پر باطل ہو چکا ہے، ہمارے محترم بھائی یعنی فاضل مصنف کی نوع کے نابغوں کا وجود ایک منفرد، حیران کن اور عدیم النظیر مثال ہے۔ معذرت خواہ ہوں۔

کتابِ ھذا پانچ ابواب پر مشتمل ہے جن میں مختلف مکاتیب نقل کیے گئے ہیں جو دراصل خالصتاً مختلف اصحابِ نظر کی جانب سے اظہارِ عقائد پر مشتمل ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ مطبوعات پر تبصرے بھی پائے جاتے ہیں۔ البتہ ان تمام عبارات میں "چاشنی" پیدا کرنے کی غرض سے ساتھ ساتھ فاضل مرتب و مولف کی بے لاگ ڈانٹ پھٹکار بھی شامل حال نظر آتی ہے۔ یہ ڈانٹ پھٹکار دراصل ایک نہایت غیر متعلق قسم کی علمیت کی بھرمار پر مبنی ہے۔ ایک ایسی شاہکار علمیت جس کے سیلِ بے پناہ میں متضاد اور متخالف قسم کے لاتعداد عناصر کو غیر ضروری طور پر باہم یکجا کرتے ہوئے ایک بے نتیجہ طوالانی بحث کو جنم دیا گیا ہے۔ فاضل مصنف کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا کہ آزاد انسانوں کی آزاد سوچ و فکر کو قدیمی زنگ خوردہ عقائد و فلسفے کے تنگ و تاریک دائرے میں بالجبر مقید اور پابند کر دیا جائے۔ اور پھر اپنی فکری اور علمی بالا دستی سے حظ اُٹھایا جائے۔ بہر حال اس ناچیز کے لیے مختلف علمی میدانوں سے اٹھائے گئے افکار کا اندراج خاصا دلچسپ اور خرد افروز ہے جس کے لیے محترم بھائی کی کاوشوں کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔

فاضل مرتب کے ہم خیال روایت پرست محاذ کی جانب سے شامل کیے گئے ان متعدد مکاتیب میں مخالف گروپ کی جانب سے صرف ایک عدد مکتوب شامل کیا گیا ہے جو جناب اکرم پردیسی، جھنگ کا تحریر کردہ ہے۔ باقی مواد کا غالب حصہ یکطرفہ فتویٰ بازی کے مقصد سے عبارت ہے۔ سچ کہنے پر پھر معذرت خواہ ہوں۔

دونوں جوانب کے مکاتیب میں اگر شائستگی اور مقصدیت کے عناصر تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو اس عاجز کی رائے میں اس کی کسی قدر مقدار پہلے گروپ میں صرف جناب ابوالخیر اسدی کے مکاتیب میں پائی جاتی ہے۔ البتہ یہی عناصر مخالف گروپ کے جناب اکرم پردیسی کے تحریر کردہ مکتوب میں بدرجہ اتم ملتے ہیں۔ ایک لفظ بھی متشدد یا قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ فلہذا دعائے خیر ہے ان دونوں فاضل حضرات کے حق میں کہ کتاب کا معیاری اور پُرامن جزء، گو معدودے چند صفحات میں ہی پایا جاتا ہے، لیکن صرف انہی کی تحریروں سے تشکیل پاتا اور انہی کا مقروض ہے۔

نیز اگر اس تمام گفتگو میں علم و سند پر مبنی دلائل کی تلاش کی جائے تو اس ناچیز کی رائے میں صرف جناب اکرم پردیسی کا مکتوب اس حوالے سے تحریر کے تقاضے پورا کرتا نظر آتا ہے جہاں لغات کے حوالے، لفظ کے مادے کی تحقیق، تصریفِ آیات اور تقابلِ ضدین کے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے استدلال پیش کیا گیا ہے۔ بیشک علمی استدلال کا حق اسی خوش اسلوبی کے ساتھ، بحث کے مرکزی نقطے پر مرکوز رہتے ہوئے، ادا کیا جا سکتا تھا۔ پس مزید دعائے خیر ہے جناب اکرم پردیسی صاحب کے لیے۔ اللہ تعالیٰ انہیں علم و فضل کی رفعتوں سے ہمکنار فرمائے۔ آمین۔

بقایا جملہ تحاریر غیر مستند ذاتی آراء، فرسودہ اور بے بنیاد عقائد، استخراجی منطق، مرگ آفریں فلسفہ، زولیدہ فکری، بے جا تعصب اور فریقِ مخالف کو غیر شائستہ القابات سے مخاطب کرنے اور بلا جھجھک دہریت و کفر کی انتہائی حد تک فتوے لگانے اور اس ذریعے سے سفلی جذبات کی تسکین کرنے کے عمومی رجحانات سے لبریز ہیں۔ اگر اس عاجز پر ایک لفظ بھی جھوٹ لکھنے، یا فضول الزام تراشی کا شک ہو تو کتاب کی ایک ایک سطر کو ایک بار پھر غور سے پڑھ لیا جائے۔ یہ عاجز غلط بیانی پر معافی طلب کرنے میں ایک لحظہ کی تاخیر بھی نہ کرے گا۔ زیادتی اور دھاندلی پر مشتمل یہ تحریریں ادب کے منہ پر کیچڑ اچھالنے کے مترادف ہیں۔ فلہذا یہ امر باعثِ حیرت نہیں ہونا چاہیئے کہ جنابِ اکرم پردیسی نے سلسلۂ جواب در جواب کو آگے بڑھانے کی کسی بھی کوشش کو بے سود گردانا اور خاموشی اختیار فرمائی۔ یہ ناچیز بھی بصورتِ اکراہ اس تجزیے کی جانب لایا گیا ہے اور معذرت خواہ ہے۔

سب سے بڑا ظلم صاحبِ کتاب نے یہ کیا ہے کہ زبان کے معانی کی تفہیم کے لیے اس کے واحد ماخذ وبنیاد سے اکتساب کے بنیادی اصول کو نہ صرف یکسر نظر انداز کیا ،،،، بلکہ ،،، اس واحد میسر طریقہ کار کو ملعون و مطعون قرار دینے کی بھرپور کوشش فرمائی۔ یعنی التباس کی غیر مقبول راہ اپنائی۔ ظاہر ہے کہ یہ ماخذ وبنیاد لغات العربیہ ہی ہو سکتی ہیں۔ نتیجہ وہی پیدا ہوا جو ایک خودکار فطری اور علمی تقاضا ہے۔ یعنی قرآنی الفاظ و اصطلاحات کی ان کی جانب سے کی گئی تمام تر تشریحات کو بغیر کسی لغوی سند، صرف ذاتی عقائد اور ذاتی تاویلات کی ذیل میں درجہ بند [classify] کیا جا سکتا ہے۔ ذاتی تاویلات، التباسات اور اندھے عقائد کی کوئی علمی اساس و وقعت نہیں ہوتی، خواہ اس پر تواتر کا غیر عقلی ٹھپہ لگانے کی کتنی بھی کوشش کی جائے۔ کسی بھی غلطی کا تواتر سے ارتکاب کیا جانا اس کی صحت کے اثبات کا علمی اور شعوری جواز قرار نہیں پا سکتا۔

اسی ضمن میں صفحہ ۷۰ پر فرماتے ہیں: "قرآن و سنت میں بعض ایسے الفاظ ہیں جنہیں شرعی عرف کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے ۔ انہیں ان کے لغوی مفہوم میں استعمال نہ کیا جائے ورنہ اس سے الحاد کا دروازہ کھل جائیگا" ۔

یعنی لغات کا استعمال ہی ممنوع فرما دیا گیا اور اس پر "الحاد" کے فتویٰ کی دھمکی بھی دے دی گئی تاکہ قرآنی الفاظ و اصطلاحات کی من مانی تاویلات "شرعی عرف" کی مبہم اور لایعنی اصطلاح کے مہربان سائے میں بلاخوفِ مخالفت وخوفِ تردید گھڑی جا سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی نوعیت کے منفی اور جبری رویوں کے ضمن میں واضح تنذیر جاری فرمائی تھی کہ : "ویل اللذین یکتبون الکتاب بایدیہم، ثم یقولون ھذا من عنداللہ"[آیت مبارکہ: ۲/۷۹] یعنی "تباہی ہے ان لوگوں پر جو اپنے ہی ہاتھوں اپنی من مرضی کے قاعدے قانون گھڑتے ہیں پھر اسے منجانب اللہ قرار دے دیتے ہیں"۔ پس مقامِ عبرت ہے اس من گھڑت "شرعی عرف" کے تاویل نما قانون پر، جو نہ اللہ کی جانب سے متعارف کیا گیا اور نہ ہی رسول کی زبانِ مبارک سے تجویز کیا گیا۔ روزِ حشر کی

تعزیروں کے موجب ایسے اختراعاتِ باطلہ سے اپنے مالک و آقا کی مغفرت طلب کرنی چاہیئے۔ صدقِ بسیط اور نفس الامر کی راہ کے مسافروں کو اس قبیل کی اختراعات سے کوئی علاقہ یا واسطہ نہیں۔

تمام تر مشقتوں اور دھمکیوں کے پسِ پردہ وہی واحد مقصد پوشیدہ نظر آتا ہے کہ کہیں لفظ "صلٰوۃ" کا معانی سمجھنے کے لیے مستند عربی لغات کو کھول کر نہ دیکھ لیا جائے۔ کہیں تصریف الآیات کی ترکیب سے یا تقابلِ ضدین کے فارمولے سے صلٰوۃ کا عظیم الشان مقصود و منتہاء دریافت نہ کر لیا جائے۔ کہیں منقولی فلسفے کی بجائے معقولیات کا سیدھا راستہ اختیار نہ کر لیا جائے۔ کہیں اس ڈھول کا پول نہ کھل جائے جو آج تک انسانوں کو گمراہ کرنے، بیوقوف بنانے اور اپنا اُلو سیدھا کرنے کیلیے بجایا جا رہا ہے۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ خالقِ کائنات اپنی کتابِ ہدایت میں اس ڈھول کا پول یہ کہ کر کھول چکا ہے کہ: "انَ کثیراً من الاحبار والرہبان لیاکلون اموال الناس بالباطل و یصدون عن سبیل اللہ" [آیت مبارکہ:] یعنی "درحقیقت اکثریت ان ملّاوں اور شیوخ کی ایسی ہے کہ لوگوں کے مال دھوکے سے کھاتے ہیں اور اسی دھوکے کے ذریعے اللہ کی طرف لے جانے والے راستوں میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں"۔ پس اللہ تعالیٰ کی پاک ذات سے دعا ہے کہ سب محترم بھائیوں کو سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

عمومی تجزیہ

محترم قارئین، اس ناچیز کا عمومی رویہ یہ ہوتا ہے کہ جن تحاریر سے فتویٰ بازی ٹپکتی ہو اور انداز واضح طور پر مناظرانہ ہو، ان پر تبصرے سے احتراز برتا جائے۔ تاکہ کیچڑ اچھالنے کی مذموم مہمات سے واسطہ نہ رکھتے ہوئے خود کی عزتِ نفس کا تحفظ بھی کیا جائے اور دیگر اصحاب و فریقین کا رائے اور اظہار کا حق بھی کھلا چھوڑ دیا جا سکے۔
لیکن موجودہ اسلامی دنیا کے ٹھیکیدار حضرات اپنے علاوہ کسی آزاد انسان کو جینے نہیں دینا چاہتے۔ اگر یہ حق وہ کسی کو عطا بھی کرتے ہیں تو صرف اپنی ذہنی غلامی کے معاوضے کے طور پر۔ اور ان کا مثالی غلام وہ ہے جو یہ شرائط پوری کرتا ہو: صمَ، بکم، عمی، فہم لا یرجعون ۔[آیتِ مبارکہ: ۱۸/۲] یعنی گونگا، بہرہ، اندھا ہو کر ان کی سنے اور کبھی سیدھے راستے کی جانب پلٹنے کی کوشش نہ کرے۔ یہ رویہ بہر حال پڑھنے والوں کو کچھ نہ کچھ احتجاج کا حق ضرور دیتا ہے۔

کتابِ زیرِ تبصرہ پہلی نظر میں ہی اپنے عنوان کے تناظر میں ایک متشددانہ اور متنازعہ فیہ حیثیت کی حامل باور ہوتی ہے جس پر کچھ بھی لکھنے سے ایک عاجز اور امن پسند انسان کی طبیعت اُبا کرتی ہے۔ تاہم کچھ قریبی اعزاء کی خواہش پر پہلے پہل تو معذرت سے کام چلانا

چاہا، پھر اصرار کے پیشِ نظر ایک مختصر سی رائے دینے کی کوشش کی ہے۔ **رائے خالصتاً ذاتی ہو گی جس سے متفق ہونا ضروری نہ ہو گا۔ اور وہ رائے کتابِ مذکور کے مواد کے ایک انتہائی غیر جانبدارانہ مطالعہ پر مبنی ہو گی۔** ذاتیات کے ذکر سے پرہیز کی کوشش کی جائیگی اور القابات اور فتاویٰ کی اُس مذموم روایت کی پیروی ہر گز نہ کی جائیگی جس کا سبق کتابِ زیرِ نظر سے حاصل ہوا ہے، کیونکہ یہ سبق انسان کے اخلاقِ حسنہ کی قربانی کا تقاضا کرتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ نوٹ کی گئی کہ بات "صلوٰۃ کے انکار" سے شروع ہوئی جو خود ہم راسخ العقیدہ مسلمانوں کے مابین ایک اختلافی اور حل طلب مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن کوئی قابلِ قبول حل تلاش کرنے کی بجائے بات کو بڑھاتے ہوئے اس میں دیگر ان گنت موضوعات کو شامل کر لیا گیا۔ جس کے سبب نہ صرف کتاب ایک چوں چوں کا مربہ بن گئی بلکہ بقول شاعر وہ کیفیت پیدا کر دی گئی کہ : "**کہ رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ۔۔۔۔۔۔ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی**"۔ اس ناچیز کے مطابق کتاب کا اصل موضوع **"صلوٰۃ" بمقابلہ پرستش کی جسمانی رسم "نماز"** کا قدیمی قضیہ ہے، جس کے ضمن میں ایک گروہ پر فتوے بازی کی گئی ہے اور دل کھول کر، اطاعتِ رسول اور اسوہِ رسول کی خلاف ورزی کا ارتکاب فرمایا گیا ہے۔ نہ صرف متنوع اور متضاد نوعیت کے القابات تھوپے گئے ہیں بلکہ تُو تکار کا انتہائی غیر ادبی اور ناشائستہ اسلوب بھی آزادی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرامین: ۳۳/۷۰ : قولو قولاً سدیداً ۔۔۔۔۴/۵: قولو لہم قولاً معروفاً ۔۔۔۱۷/۵۳: یقولو التی ھی احسن ۔۔ ۔۴۹/۱۱: و لا تنابزوا بالالقاب ۔۔۔۔ و لا تلمزوا انفسکم ۔۔۔۔۱۷/۷۰: و لقد کرمنا بنی آدم۔۔۔ ۔ کو نہ صرف نظر انداز کیا گیا ہے بلکہ اان احکامات کی ضد میں ایسا مواد تحریر کیا گیا ہے جو غضبِ الٰہی کو دعوت دیتا ہے اور حقوق انسانیت کو غصب کرنے کے زمرے میں آتا ہے۔

کتاب کے محترم مرتب اور دیگر اصحابِ تحریر اور ناشر ادارے کے ہاں ایسا رویہ اختیار کرنا یقیناً مخالف گروپ کی ہتک و تذلیل کرنے کا ایک سفلی مقصد رکھتا ہو گا۔ لیکن ہوا اس کے برعکس یہ ہے کہ ان محترمین نے اس قسم کا اسلوبِ تحریر اختیار فرما کر خود اپنا کیس نہ صرف کمزور کر لیا ہے بلکہ فنِ تحریر کے اس معیار سے ہی فروتر ہو گئے کہ جہاں کسی لکھاری کی بات کو وزن دیے جانے کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ نتیجے میں ایک محنت سے تیار کردہ کتاب جس کا تناظر بدقت تمام وسیع تر کیا گیا تھا، اور جو علم و خبر اور کشف و انکشاف کی حامل ہونی چاہیئے تھی، ایک غیر معیاری خامہ فرسائی کے درجے تک گر گئی۔

آخر کوئی پڑھنے والا کس موضوع پر توجہ کرے اور اسے کیسے سمجھ پائے، کیوں کہ فاضل مصنف عنوان کی رُو سے انکار صلوٰۃ سے ابتدا کرتے ہیں، پھر اس کے ڈانڈے زمانے بھر کے موضوعات سے ملا دیتے ہیں۔ "تقدیم" کے عنوان کے تحت "فلسفہِ الٰہیات کی

اہمیت" پر بات شروع فرماتے ہیں، یہاں "علت و معلول" کے حوالے سے دوسرا فتویٰ صادر ہوتا ہے کہ "اہلِ قرآن انسان، زمانہ اور سارے عالمین کو قدیم مانتے ہیں، اور، اور،،،،،،

یہاں ذرا توقف فرمایئے،، کیونکہ،،،،، یہ عاجز بہتر باور کرتا ہے کہ،،،،، اُن تمام الزامات کی ایک باقاعدہ فہرست بنا دی جائے جن کے ہمراہ کتاب کے اولین صفحات کی ابتدا ہوتی ہے، تاکہ بات قدرے آسان ہو جائے۔ ملاحظہ فرمائیں کس قدر دُور از کار اور بعید از قیاس الزامات، کتنی شانِ بے نیازی کے ساتھ عائد کیے گئے ہیں:-

فہرستِ الزامات

١۔ اہلِ قرآن ایک علیحدہ صنف اور الگ فرقہ ہیں۔ ٢- یہ صنف فلسفے سے شغف رکھتی ہے۔

٣- یہ معتزلہ کے انداز میں "حادث و قدیم" کی بحث میں ملوث ہے۔

٤- یہ اللہ تعالیٰ کو مجبور اور مضطر مان لینے کے مجرم ہیں۔

٥- یہ تصورِ الٰہ، تخلیق، انسان، رسالت، قیامت، معجزات، ارکانِ اسلام اور فلسفہِ زمان و مکان کے افکار میں خام ہیں۔

٦- یہ قرآن کو صرف "نیچرل ازم کی مینیفیسٹو" مانتے ہیں۔

٧- ان کے نزدیک قرآن ایک حقیقت نہیں بلکہ تمثیلی واقعہ کا نام ہے۔

٨- یہ اہلِ قرآن خود اپنے وجود کا اثبات نہیں کر سکتے۔

٩- یہ رسول کی ذات کو بشریت سے خارج کر کے الوہی صفات کی متحمل ثابت کرتے ہیں جس سے اطاعتِ رسول کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ١٠ - اہلِ قرآن نے انسان کو بھی مقامِ عبدیت سے خارج کر کے مظہرِ صفاتِ الٰہی بنا دیا ہے-

١١- یہ "جدیدیاتی دہریت" کا شکار ہیں۔

١٢- ان کے لیڈران سرسید اور پرویز منصور حلاج اور ابنِ عربی کے فلسفے کے ترجمان ہیں۔

۱۳-   قرآن کے فلسفہِ الٰہیت سے انکار کرتے ہیں۔   ۱۴-   مستشرقین کے لگائے ہوئے تخم کی آبیاری کرتے ہیں۔

۱۵-   منکرین صلوٰۃ لاریب کتاب کو منبع ہدایت نہیں مانتے۔

۱۶-   یہ لوگ صرف تمثیلی تاویلات اور عقلی رجحانات پر مشتمل کتب کو ترجیح دیتے ہیں۔

۱۷-   منکرین صلوٰۃ کی تاویلات کا آغاز یونانیت سے ہوا، اور اہلِ قرآن کے افکار کی صورت میں جدید زمانے میں داخل ہو چکا ہے۔   ۱۸-   پرویز صاحب اور اسلم جیراج پوری وحدت الوجودی تھے۔

وغیرہ،وغیرہ،،،،،،،،،،،،،،

صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام الزامات بے سروپا نوعیت رکھتے ہیں، غیر سنجیدہ اور غیر مستند ہیں، ذاتی تعصب اور تاویلات پر مبنی ہیں اور حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔ اپنے ہی دینی بھائیوں کے خلاف اس قسم کی بے حدود و قیود الزامات کی بارش کسی قسم کا تعمیری یا اصلاحی مقصد پورا نہیں کر سکتی، سوائے اس کے کہ امت کے اتحاد کو مزید پارہ پارہ کرے اور ایک منفی تہذیب اور تخریبی ادبی رجحان کو پروان چڑھائے۔ پس فتنہ پروری کے اس سنگین میلان پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی پناہ طلب کرنے کی ضرورت ہے۔ العیاذ باللہ۔۔۔۔۔

الزامات کی درج بالا فہرست کے علاوہ بھی دیگر متعدد موضوعات ہیں جو اس کتاب میں لاحاصل ہی زیرِ بحث لائے گئے ہیں اور جن کی بناء پر یہ عاجز اس تحریر کے لیے "چوں چوں کا مربہ" کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہوا۔ ان کی تفصیل بھی مختصراً کچھ اس طرح سامنے آتی ہے:-

"اللہ تعالیٰ کا تقرب؛ عبدیت اور عبادت کا مفہوم؛ صفات اور موصوف؛ عیسائیت میں ابن اللہ کا فلسفہ؛ الحاد؛ تمثیلی اور وحدت الوجودی الحاد؛ توحید؛ رسالت؛ آخرت؛ صلوٰۃ کی قبولیت کا معیار اطاعتِ رسول کے بغیر ناممکن ہے؛ مستشرقین کے مقالے اور علمی ریسرچ؛ قرآن کی تشریح و تفسیر کا "تکمیلی ماخذ" خود قرآن ہے اور "تعمیلی پہلو" اسوہِ رسول اور اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہے؛ باطنیہ فرقوں اور اہلِ تشیع کے علماء کی جانب سے لغوی معانی کی تحریف کی مثالیں، ان مثالوں کا اہلِ قرآن پر بلا جواز منطبق کرنا؛ عالمین کا مبدا آ اول اور اس سے عالمین کا صدور؛ Logos کی تھیوری؛ غلام محمد قادیانی کی ظلی اور بروزی نبوت؛ حقیقتِ محمدیہ؛ صفاتِ الٰہی؛ حدودِ بشریت؛ پرویز اور قادیانیت میں مماثلت؛ وغیرہ، وغیرہ،وغیرہ،،،،،،،،،،،،،،،،" پناہ بخدا !!!

مزید وقت کے ضیاع سے بچتے ہوئے اور ان تمام دور از کار موضوعات سے فی الحال جان بچاتے ہوئے ہم اصل موضوع کی جانب پیش قدمی کرتے ہیں جو زیرِ نظر کتاب کی اصل الاساس ہے۔

منکرین صلوٰۃ کا فتویٰ۔

کیا یہ فتویٰ کوئی شرعی یا قانونی جواز رکھتا ہے۔۔۔یا۔۔۔صرف توہینِ انسانیت کے مترادف ہے؟

کیونکہ تحریر کی تمامتر کاوش منکرین صلوٰۃ کو ملعون و مطعون کرنے کا واحد مقصد رکھتی ہے اس لیے اب ہم سب سے قبل یہ تحقیق کیے لیتے ہیں کہ آیا یہ اصطلاح کوئی جواز، ثبوت یا دلیل بھی رکھتی ہے۔۔یا۔۔۔ محض توہینِ انسانیت کے سفلی جذبات کے تحت یا کسی وقتی افتادِ طبع کی بناء پر گھڑ لی گئی ہے۔

منکر صلوٰۃ کا معنی ہے صلوٰۃ کا انکار کرنے والا۔ صلوٰۃ قرآن کی عظیم الشان اصطلاح ہے اور قرآن کے طول و عرض میں مختلف انداز میں قرآن کے ادبِ عالی کے اسلوب میں جا بہ جا مندرج ہے۔ کوئی بھی مسلمان اس کے وجود سے یا اس کے حکم سے نہ ہی انکار کر سکتا ہے اور نہ ہی کرتا ہے۔ نہ ہی راقم الحروف نے اپنی عمرِ عزیز کے دورانیے میں آج تک کسی بھی فردِ واحد کو صلوٰۃ کا انکار کرتے ہوئے پایا ہے۔

تو بھلا جنہیں اسی کتاب میں اہلِ قرآن کا نام دیا جا رہا ہے انہی پر کیسے قرآن کے الفاظ سے انکار کا جرم بھی عائد کیا جا رہا ہے؟ یہ تو کسی فاتر العقل تحریر کا خاصہ ہوتا ہے کہ تضادات سے پُر گفتگو کی جائے اور اپنے ہی قول و قرار کی نفی میں الفاظ سپردِ قلم کیے جائیں۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ مخاطبین کی تذلیل مطلوب ہو۔

قرآن کے الفاظ و احکام سے انکار تو صاحبانِ تحریر ہی کو زیب دیتا ہے کیونکہ یہ وہی توہیں **جو خود کو اہل قرآن کے بمقابل اہلِ سنت و اہل حدیث وغیرہ وغیرہ کہتے اور مانتے ہیں۔ اور قرآن کو فائنل اتھارٹی نہیں سمجھتے۔** انہی صاحبان کی تحریروں کے مطابق اہلِ قرآن تو صلوٰۃ کو بڑے وسیع تناظر میں لیتے ہیں اور اسے صرف اُٹھک بیٹھک جیسے فضول عمل سے بلند کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے قوانین کی پیروی کے عظیم معانی کے مترادف قرار دیتے ہیں۔

وہ تو صلوٰۃ کو قیام، رکوع و سجود کے لفظی اور جسمانی معانی، یعنی کھڑے ہو جانا، جھک جانا اور منہ زمین پر ٹکا کر دبر اونچی کر لینا، کی سطح سے اُٹھا کر انسان کے فرائضِ منصبی کے اعلیٰ ادبی و استعاراتی مفہوم کی جانب لے جاتے ہیں جہاں قیام، اللہ تعالیٰ کے احکامات پر

مضبوط موقف کے ساتھ ڈٹ جانا، رکوع، ان کی حقانیت کے آگے جھک جانا، اور سجود، ان کی تعمیل میں سر تاپا مصروف و منہمک ہو جاناہے۔

یہ وہ مفاہیم ہیں جو عربی زبان کی مستند لغات میں مندرج ہیں اور جن کا انکار فاضل مصنف تو کجا، خود عربی زبان کا کوئی جید عالم یاماہر لسانیات بھی نہیں کر سکتا۔ فاضل مصنف و مرتب نے خود اہلِ قرآن گروپ میں سے جناب اسلم پردیسی کا مکتوب اور دیگر ہدفِ تنقید حضرات کے اقتباسات اس کتاب میں شائع فرمائے ہیں، جن میں آپ کہیں بھی ان حضرات کی جانب سے صلوٰۃ کا انکار ثابت نہ کر سکیں گے۔ بلکہ اس کے برعکس انہی حوالوں میں صلوٰۃ کو وسیع تر تناظر میں قبول کرتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ **پھر انہیں آپ کیسے منکرین صلوٰۃ کہ کر پکارتے ہیں؟**

پس منکرینِ صلوٰۃ کا فتویٰ جس کی بھرمار زیرِ نظر کتاب میں کی گئی ہے، یا تو علم سے نابلد لوگ گھڑ سکتے ہیں، یا وہ جن کے اخلاقِ حسنہ کو تعصب کی آگ نے جلا کر بھسم کر دیا ہو اور منطق سے عاری نفسِ حیوانی کے جبلی تقاضوں نے اعلیٰ وارفع شعوری صفات کو پس پشت ڈال دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

حقیقی منکرین صلوٰۃ کون؟

مختصراً، **منکرین صلوٰۃ وہ لوگ ہی ہو سکتے ہیں جو صلوٰۃ کے حقیقی مستند لغوی معانی سے انکار کرتے ہیں۔** اور اسے اُس پرستش یا پوجا کے عمل سے موسوم فرماتے ہیں جسے عرفِ عام میں نماز کہا جاتا ہے۔ جس کی تقلید سے آج تک امت کو کوئی منفعت حاصل کرتے ہوئے نہیں پایا گیا۔ اور جس کی ادائیگی کے طریق کار میں اتنے فرقہ وارانہ اختلافات موجود ہیں کہ ایک کے طریق کار سے دوسرے کی نماز ہی ادا نہیں ہوتی۔ اور جہاں صرف چند جسمانی حرکات اور چند عربی کلمات ادا کرنے کے بعد یہ باور کر لیا جاتا ہے کہ ایک فریضہِ عظیم ادا ہو گیا ہے اور گناہوں اور جرائم سے فوری معافی مل گئی ہے۔ اور اس آسان معافی کے شیطانی فلسفے کی ترویج نے امت مسلمہ میں گناہوں، جرائم اور دیگر اخلاقی پستیوں کی ایک انسانیت سوز قیامت برپا کی ہوئی ہے۔

صلوٰۃ کا حقیقی معانی کیونکہ ایک جاں گسل جد وجہد کا متقاضی ہے اس لیے اس فریضہ میں شامل صعوبتوں سے جان بچا کر اس کو ایک نہایت آسان جسمانی مشق میں تبدیل کر لینا، جو صرف چند منٹ میں ادا ہو جاتا ہے، ہماری عیاش اور بے کسب وہنر مذہبی پیشوائیت کو نہایت موزوں باور ہوا۔ اس لیے اپنے حاکم آقاوں کی مدد سے اس منتقلی کو باضابطہ طور پر اختیار کر لیا گیا۔ اور یہی صورت آج تک مروج و متوارث چلی آتی ہے۔

بہت ہی معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ یہ ایک غیر عقلی اور غیر منطقی ڈھونگ ہے جو زندہ اور آزاد سوچ رکھنے والے باشعور انسان کبھی بھی درست تسلیم نہیں کر سکتے۔ اس کے رواج کا سہرا ان مذہبی ٹھیکیداروں کے سر بندھتا ہے جو بڑی بڑی مساجد اور مدارس

کھول کر بیٹھے ہیں اور پوجا پاٹ کے اس ڈھونگ سے جن کی روٹی، روزی اور اقتدار وابستہ ہے۔ جنہیں نماز کے اس مروج کردہ فلسفے سے پیدا شدہ المیے سے کوئی غرض نہیں۔ آج اس قوم کے اسّی فیصد ناخواندہ اور پسماندہ ذہنیت کے ہم وطن ان کے آسان شکار بننے کو تیار ہیں۔

یہی وہ لوگ ہیں جو ما قبل میں بیان کیے گئے "شرعی عرف" کی قسم کی خواہش پرستانہ، مبہم اصطلاحات گھڑتے ہیں اور اس التباس کی آڑ لے کر انسانوں کو صلوٰۃ کا لغوی مفہوم اپنانے سے روکتے ہیں۔ اور جو بھی ایسا کرتا نظر آجائے اسے ملحد قرار دینے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ نیز یہ صلوٰۃ کے فریضے کی بجائے "نماز" کی رسم کے تواتر کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے اور اس تواتر کی فضیلتیں گنواتے نہیں تھکتے۔ تو پھر آیئے اس نمازِ متواتر کی نام نہاد فضیلتوں کے ڈھول کا پول کھول دیتے ہیں۔

چند لمحے کے لیے فرض کیے لیتے ہیں کہ نمازیں شروع ہجری سال سے ہی پڑھی جارہی تھیں۔ اور پھر دیکھتے ہیں کہ ہماری اسلامی تواریخ کی روشنی میں ان نمازوں کے "شاندار" نتائج شروع زمانے سے آج تک کس طرح کے رہے۔

تواتر سے نماز پڑھنے کی برکتیں اور فضیلتیں

"صرف لگ بھگ ۳۵ ہجری میں ہی مدینۃ النبی[ص] پر نمازیں پڑھنے والے حملہ آور ہوئے۔ خراساں تک پہنچ جانے والی عسکری طاقت کی مالک حکومتِ اسلامیہ اپنے دارالحکومت اور حکمران کا تحفظ چند سو آدمیوں کے خلاف بھی نہ کر سکی۔ حضرتِ عثمان [ر] کا مقدس خون بہایا گیا۔ حضرت علی [ر] کے خلاف نمازیں پڑھنے والوں نے جنگِ جمل، جنگِ صفین اور جنگِ نہروان لڑیں اور ہزاروں لاکھوں نمازیوں نے ایک دوسرے کا خون بہایا۔ قرآنوں کو نیزوں میں پرو کر سروں سے اونچا کرنے کی بے حرمتی انہی نمازیوں نے کی۔ اسلامی انتہا پسندی اور دہشت گردی اسی قرونِ اولیٰ میں فتنہ خوارج کی شکل میں نمودار ہوئی۔ پھر حضرت علی کا مقدس خون بہایا گیا۔ صرف ۴۰ ویں ہجری سال میں ہی نمازیں پڑھتے ہوئے امیر معاویہ[ر] کی ڈکٹیٹر شپ، یعنی ملوکیت، اور فرزند کو جانشین بنا دینے والی موروثی بادشاہت وجود میں آئی جو اموی خلافت کا روپ اختیار کر کے جبر و دہشت کی علامت بن گئی۔ نمازیں تواتر سے پڑھی جاتی رہیں۔ حضرات حسن و حسین کو شہید کر دیا گیا۔ نمازیں پڑھی جاتی رہیں۔ محلات تعمیر ہوتے رہے۔ جاگیریں بٹوری جاتی رہیں۔ دولت کے انبار جمع ہوتے رہے۔ سینکڑوں عورتیں خرید کر حرموں میں تصرف کے لیے رکھی جانے لگیں۔ انسان بازاروں میں غلاموں کی شکل میں بکتے رہے۔ نمازیں پڑھی جاتی رہیں۔ صلوٰۃ کے حقیقی معانی کا نعرہ لگانے والوں کی کرایہ کے علماء و فقہاء سے فتوے لگوا کر کھالیں کھینچی جاتی رہیں۔ فرقے وجود میں آتے رہے اور علماء و فقہاء آپس میں دست و گریباں رہے، اور نمازیں پابندی سے پڑھتے رہے۔ انہی کے بارے میں مولانا روم نے فرمایا تھا کہ: "دینِ حق را چہار ملت ساختند۔۔۔۔۔ فتنہ در دینِ

نبی اند اختند" - یہ نمازیں آج بھی پڑھی جا رہی ہیں۔ تمام عالمِ عرب بدمعاشی، فحاشی، عیاشی اور دین فروشی کا اڈا بن چکا ہے۔ آپ کے میرے اور دیگر شہروں میں معصوم انسانوں کے چیتھڑے یہی باریش نمازی بموں کی بارش کے ذریعے اُڑا رہے ہیں۔ نمازیں پڑھی جا رہی ہیں۔ تلقین بھی جاری ہے۔ کیا یہ سب کچھ ایک حقیقتِ ثابتہ نہیں ہے کہ حقیقتاً صلوٰۃ کے حکم کی اصل روح ہم نے صدرِ اول ہی میں کہیں، رحلتِ رسول کے بعد کے برسوں میں گنوا دی اور غیر قرآنی "نماز" کو تمام تر مقصود و منتہا بنالیا۔ اور پھر اسی ہی گناہِ عظیم کی پاداش میں آج تک جسدِ امت زخم زخم ہے۔"

صلوٰۃ کے حقیقی معانی کی تشریح

جناب اکرم پردیسی صاحب نے اپنے مکتوب میں صلوٰۃ کے مادے اور اسکے استعمالات کی تشریح مناسب انداز میں کر دی ہے، نیز تصریف الآیات کی مدد سے ایسے کچھ مقامات کی تشریح بھی کر دی ہے جہاں صلوٰۃ کا معنی جسمانی پرستش کی حرکات قطعاً نہیں ہو سکتی، مثلاً ارض و سماوات کی ہر شے کی صلوٰۃ اور پرندوں کی صلوٰۃ اور تسبیح۔ پھر صلوٰۃ کا ضیاع اور شہوات کا اتباع، وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی جناب اکرم پردیسی نے تقابلِ ضدین کی مدد سے بھی بات ناقابلِ تردید انداز سے ثابت کر دی ہے۔ پھر آیت "اتل ما اوحی الیک من الکتاب و اقم الصلوٰۃ [۲۹/۴۵] واضح طور پر حکم دیتی ہے کہ جو کچھ تمہیں کتاب کے ذریعے وحی کیا جاتا ہے اس کی پیروی کرو [اتل] اور اسی پیروی کا پورا ایک ڈسپلن یا نظام قائم کرو۔ "تلاوۃ" بھی پیچھے پیچھے جانے کا مفہوم دیتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں: " وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا ﴿١﴾ وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَاهَا ﴿٢﴾ [۹۱/۱] اور قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی، اور قسم ہے چاند کی جب وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ اور پھر آیت ۴۱/۲۲ : جہاں اقاموا الصلوٰۃ اور آتوا الزکاۃ کے لیے تمکن فی الارض کی ناقابلِ تردید شرط لگا دی گئی ہے، کیونکہ نظاموں کا قیام صرف اپنی زمین پر اپنا اقتدار قائم کرنے پر ہی ممکن ہوتا ہے۔ اگر صلوٰۃ نماز ہوتی تو یہ شرط ہرگز نہ لگائی جاتی، کیونکہ مسلمان اپنے غلامی کے زمانوں میں بھی نماز تو بہرحال پڑھتے ہی رہے ہیں۔

قدیم اور حادث / ذات وصفات / وحدۃ الوجود / وغیرہ، کی لایعنی بحث

کتاب میں غالباً معاملات کو الجھانے کی غرض سے معتزلہ کے اسلوب میں کچھ اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں اور کچھ قدیم صوفیاء کے فلسفے سے وحدت الوجود کے ضمن میں موشگافیاں بھی موجود ہیں۔ اور غالباً اگر یادداشت ساتھ دے، تو کچھ ارسطو اور افلاطون کے

خیالات کا ذکر خیر بھی تبرکاً شاملِ حال کر دیا گیا ہے۔ تو آیئے اب اس طرف نظر ڈال کر اس الجھاوے کو مختصر الفاظ میں سلجھا کر تحریر میں نظر آنے والے فلسفیانہ تناظر کو آسان کرنے کی ایک پر خلوص کوشش کر لیتے ہیں۔
فی الحقیقت ان اضافوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان یا کوئی بھی دیگر مخلوق اللہ کی صفات کو لے کر پیدا نہیں ہو سکتی، کیونکہ صفات ذات سے الگ نہیں ہو سکتیں۔ کتاب کے مطالعے سے اس ناچیز پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مقصد تحریر دراصل نماز کی جسمانی رسم کا انکار کرنے والوں کو دہریہ ثابت کرنا ہے۔ اس لیے کتاب میں داخل کردہ تمام متنوع اقسام کا مواد اسی نیت و ارادے کو ثابت کرنے کی ایک طولانی کوشش ہے۔
اسی خواہش کے پیشِ نظر، فاضل مصنف کے مطابق : ["منکرین صلوٰۃ" یا "اہلِ قرآن" کا گروہ انسان کو اپنی ذات میں اللہ کی صفات کی نمود کا سبق دیتا ہے اور اسی کو حیاتِ آخرت میں منتقلی کا معیار و پیمانہ قرار دیتا ہے۔ لیکن کیونکہ اللہ کی صفات اللہ کی ذات سے الگ نہیں ہو سکتیں فلہٰذا یہ گمراہ کُن رویہ ہے۔ اللہ کی صفات میں شریک ہونا خود کو اللہ کی ذات میں شریک کرنا ہے۔ پس خود کو خدا ماننا ہے۔ اس لیے اہلِ قرآن بھی وحدۃ الوجودی ہیں۔ نیز جب انسان کو خدا مان لیا جائیگا تو خدا کا وجود غیر موجود ہو جائیگا اور اس سے دہریت کا اثبات وقوع پذیر ہو جائیگا۔ وغیرہ۔] قارئین خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کیا ایک صاحب علم کی جانب سے یہ ایک بودا، بے بنیاد، عجیب و غریب اور دور از کار استدلال نہیں ؟

راقم کی رائے میں در حقیقت یہ سب قدیمی اور فرسودہ نظریات ہیں۔ ایک مردہ اور کالعدم تہذیب کے ساتھ وابستہ ہیں۔ جدید زمانے میں جدید سائنسی علوم کی روشنی نے قرآن کے فلسفہ الٰہیات اور عبودیت کو نہایت آسان فہم بنا دیا ہے اور اس سمت میں مزید ارتقائی پیش رفت بہ سرعتِ رفتار جاری ہے۔ معتزلہ کا علمِ کلام اور صوفیاء کی وحدت الوجودی منطق کا ، جس کا کتاب میں اعادہ و احاطہ کرنے کی بے مقصد کوشش کی گئی ہے، آج کے ترقی یافتہ علوم کی روشنی میں بطلان کیا جا چکا ہے۔
یہاں اگر قارئین کے استفادے کے لیے یہ بتا دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ معتزلہ کے علمِ الکلام کو ایک دور میں عقائدِ اسلامیہ کے متعلق دلائلِ عقلیہ پر مشتمل باور کیا جاتا تھا اور جس کا مقصد اہلِ بدعت کا رد تھا [ابنِ خلدون] ۔ معتزلہ نے ہی فکرِ اسلامی کو علمِ کلام سے آشنا کیا اور دفاعِ دین میں دلائل عقلیہ سے کام لینے کا آغاز کیا۔ امام ابو حنیفہ کے بارے میں بھی ایک روایت ہے کہ وہ خلقِ قرآن کے قائل اور معتزلی تھے [الابانہ فی اصول الدیانہ، صفحہ ۳۵ ؛ ابوالحسن اشعری] ۔ یہ بھی کہا گیا کہ معتزلہ کی روح اور ان کا جذبہ قابلِ تعریف ہے۔ وہ جذبہ جسے اہلِ سنت نے قبول نہیں کیا۔ وہ روح جو جرات مند تھی، جو بے باک تھی، جو عقل کی علمبردار

تھی، جس روح کی آج ہمیں ضرورت ہے۔ وہ حریتِ فکر کے داعی تھے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ ان کے بعد مسلمانوں میں جتنی فکری تحریکیں اٹھیں اُن پر معتزلہ کے اثرات موجود تھے۔

مستشرق میکڈ انلڈ امام ابو حنیفہ کو پہلا شخص قرار دیتا ہے جس نے دفاع دین کے لیے طریقِ معتزلہ یعنی علم الکلام استعمال کیا [**Encyclopedia of Islam**]۔

تاہم، اس ناچیز کی حقیر رائے میں معتزلہ کا علم الکلام ایک ایسا گورکھ دھندا تھا جو فارغ البال انسانوں کو میسر فالتو وقت کی پیداوار تھا۔ معتزلہ کی حقیقت کیا تھی یہ بیان کرنے کا یہاں موقع و محل نہیں کیونکہ موضوع طوالانی ہے۔ آج کا جدید تعلیم یافتہ باشعور انسان جو اندھی تقلید کی بیساکھیاں توڑ چکا ہے اور وقت کے ایک ایک لمحے کی قدر سے آگاہ ہے، اس قماش کے علم ا لکلام کو سمجھنے پر وقت ضائع کرنے کو تیار ہی نہیں ہے۔ اس علم الکلام کی ہیئت کذائی کی تفہیم کے لیے معتزلہ سے متعلق میسر لٹریچر سے ایک چھوٹا سانمونہ ذیل میں پیش کر دیا جاتا ہے، جس میں ذات وصفات اور قدیم وحادث کے کالعدم افکار پیش کر دیے گئے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:-

""صفاتِ باری تعالیٰ

اگرچہ بعض معتزلہ کا بیان ہے کہ اللہ تعالی۔۔۔عالم بذاتہی،،،، قادر بذاتہی،،،اور حیَ بذاتہی،،،ہے اور اگرچہ بعض یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ۔۔۔عالم بعلم،،،، قادر بقدرت،،،،اور حیَ بحیات،،،،ہے، لیکن اس کا علم اور اس کی قدرت اور اس کی حیات اس کی ذات کے علاوہ کچھ نہیں۔

مگر بعض دیگر صفات کے بارے میں معتزلہ ان سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔ مثلاً ارادہ، کلام، سمع اور بصر وغیرہ کے معاملے میں معتزلہ نہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرید بذاتہی ہے، متکلم بذاتہی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔نہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالی مرید بارادہ ہے اور ارادہ اس کی ذات ہے۔ یا متکلم بکلام ہے اور کلام اس کی ذات ہے،،، وعلیٰ ھذاالقیاس۔۔۔۔۔

بیشتر معتزلہ خصوصاً بصرہ کے معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ قدیم نہیں بلکہ حادث ہے اور کسی محل میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ارادے سے اشیاء کو عدم کی بجائے وجود سے خاص کر دیتا ہے۔

شہرستانی لکھتا ہے: "معتزلہ کو یہ قول اختیار کرنے پر ضرورتِ عقلی نے مجبور کیا کیونکہ انکارِ ارادہ کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو لازم آتا کہ افعال کا صدور طبعی افعال کی طرح غیر اختیاری ہے،،،، جیسا کہ اہلِ فطرت مانتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کو مرید بذاتہی،،، بھی نہیں مانا جاسکتا کیونکہ صفاتِ ذاتی کے لیے تعمیم شرط ہے،،، اور ارادے کو عام ماننے کی صورت میں فواحش ومنکرات کا ارادہ کرنے والا ماننا پڑتا،،،، جو کہ باطل ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارادے کو قدیم ماننے کی بھی کوئی وجہ نہیں تھی کیونکہ اسطرح دو قدیم کا اثبات ہوتا ہے،،،، اور قدامت میں اشتراک گویا الٰہیت میں اشتراک تھا۔ مزید یہ قدیم کسی شے کے ساتھ خاص نہیں ہو

سکتا۔ جب کہ لوگوں کے افعال کی صورت یہ ہوتی ہے کہ زید حرکت کرنا چاہتا،،،، اور عمر ساکن رہنا چاہتا ہے۔ گویا،، قدیم،،، کو دو ارادوں کا مرید ماننا پڑ تا ہے،،،، اور اس طرح اجتماع ضدین کی صورت پیدا ہوتی ہے۔۔۔۔ پھر یہ کہ معتزلہ ہی کے بقول مریدِ خیر ۔۔ صاحبِ خیر ہو تا ہے، اور مریدِ شر۔۔ صاحبِ شر ہو تا ہے۔ پس اگر ارادہ قدیم ہو تا۔۔۔۔ تو اللہ تعالیٰ کو صفتِ خیر اور شر دونوں سے موصوف ماننا پڑ تا،،، جو کہ غلط ہے۔۔ لہٰذا ارادے کو حادث ماننے کے علاوہ ان کے پاس کوئی صورت نہیں تھی۔۔۔ مگر ذاتِ باری تعالیٰ محلِ حوادث نہیں ہو سکتی۔۔۔ اور ارادے کا کسی دوسری ذات میں بھی اثبات نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ پس ثابت ہوا کہ ارادہ حادث ہے اور کسی محل میں نہیں۔۔۔ گویا جب اللہ تعالیٰ کسی فعل کا ارادہ کر تا ہے تو اُسی وقت اُس ارادے کو پیدا کر تا ہے۔۔۔ یہ ارادہ کسی محل میں نہیں ہو تا۔۔۔ مخلوق ہو تا ہے۔۔ اور اُس فعل کو ظاہر کر دیتا ہے۔۔۔ اور مفعول پر تقدم رکھتا ہے۔۔۔ """ختم شد
۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے ؟؟؟

غالباً اس نوعیت کی فلسفیانہ موشگافیوں سے جب علامہ اقبال[ر] کی نگاہِ دوررس کا گزر ہوا تو انہوں نے چند اشعار وضع کیے جو ان فرسودہ اور جامد عقائد و اعمال کی حقیقت پر ایک بہترین طنز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

ابنِ مریم مر گیا یا زندہ جاوید ہے — ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عین ذات
آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے — یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم — امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
تم اُسے بے گانہ رکھو عالمِ کردار سے — تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

کتاب زیرِ نظر میں درج دور از کار، قدیمی اور فرسودہ نظریات کی مردہ دنیا کو کالعدم قرار دیتے ہوئے آج کے ترقی یافتہ علوم اور انسانی ارتقاء کی موجود سطح کی جدید روشنی کی جانب پلٹیں تو بات نہایت آسانی سے سمجھی اور سمجھائی جا سکتی ہے۔ آج دنیا مادے [**matter**]، حرکت [**motion**] اور توانائی [**energy**] کے مراحل سے گذرتی، فزکس [**physics**]، میٹا فزکس [**metaphysics**]، کوانٹم فزکس [**quantum physics**] سے بھی آگے نکل کر شعور یعنی **consciousness** کو حقیقتِ مطلق ماننے کے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ آج اللہ یا خدا کا یعنی حقیقتِ مطلق کا جدید نام "شعورِ مطلق" ہے یعنی **The Absolute Consciousness**۔

حضرت انسان سمیت پوری کائنات ایک خالقِ واحد اور اس کی تخلیق کی گئی مخلوقات پر مشتمل ہے۔ حیات کی تخلیق کے پانچ ادوار ہمارے نگاہ کے سامنے ہیں اور چھٹا فائنل دور وعید کردہ ہے جس کو خالق نے دورِ آخرت کے نام سے موسوم کر دیا ہے۔ موجودہ پانچ ادوار اس طرح ہیں: ۱] کاسمک دور یعنی عناصر کی تشکیل کا دور ۲] سیارہِ زمین کی تخلیق اور اس پر فزیکل قوانین کی تشکیل و تکمیل کا دور ۳] نباتاتی حیات کی پیدائش اور متعلقہ اقدار کی تکمیل کا دور ۴] حیوانی حیات کی پیدائش اور اس مرحلے کی تکمیل کا دور اور ۵] انسانی حیات کی تخلیق کا نہایت اہم دور جس میں حیوانی جسم اور شعورِ ذات کا غیر مادی روحانی وجود مشترک کر دیا گیا ہے۔ چھٹا فائنل دور صرف شعوری ذات کا روحانی دور ہو گا جہاں مادے کی آلائش کا تصور بھی ناممکن ہو گا اور انسان اس بلند و بالا درجے میں اپنے رب کی قربت اور لقاء حاصل کر لے گا [القرآن]۔

ایک خالق، یا وہ ذات مطلق، آخر تخلیق کیوں کرتا ہے؟

اس ایک سوال کے جواب میں ہمارے محترم بھائی یعنی کتاب زیرِ تبصرہ کے فاضل مصنف، نیز دیگر قارئینِ محترمین کے تمام ذہنی مخمصوں کا حل موجود ہے۔ یعنی پوری کردگاہِ کائنات، بشمول انسان، کی آسان تفہیم کے لیے جدید ترین علوم کے مطابق فلسفہِ تخلیق کو جاننا ضروری ہے۔

اس اہم ترین موضوع کے ضمن میں پہلا اہم ترین سوال یہ ہے کہ زندگی [حیات – **life**] آخر کیا ہے۔ لیکن اس سے قبل ہمیں یہ جاننا ہو گا کہ زندگی کا مقصد کیا ہے۔ یہ ما قبل میں جانے بغیر ہم زندگی کی تعریف نہیں جان سکتے۔ پس، یہی جاننے کے لیے ہمارا پہلا سوال یہ ہے کہ **تخلیق کیوں کی جاتی ہے؟** جواب آسانیِ فہم کے لیے الگ الگ نکات کی شکل میں حاضرِ خدمت ہے:

* تخلیق اس لیے کی جاتی ہے کہ اپنے اوصاف، خوبیوں اور خصائص کے اظہار کی خواہش خالق کے اندر ایک تقاضہ پیدا کرتی ہے کہ وہ تخلیق کرے۔
* شعورِ مطلق کیونکہ خود میں یکتا ہے،،،، اس لیے اس کی شخصیت لازماً غیر محدود صفات کی مالک ہے۔
* جیسا کہ لفظ صفت [**attribute**] سے ظاہر ہے، یہ کچھ ایسی چیز ہے جو اپنے حامل یا مالک کے لیے ایک کشش اور لگاو [**attraction**] رکھتا ہے۔
* ان صفات کے اظہار و نمود کے ساتھ خالق یا شعورِ مطلق خود کو منکشف کرتا ہے۔
* دوسرے الفاظ میں اظہارِ صفات شعورِ مطلق کا فطری تقاضہ یا خواہش ہے جس کے ذریعے وہ اپنے وجود کو ظاہر کرتا ہے۔

* اپنی صفات کے اظہار کے بغیر شعورِ مطلق اپنے اس مقصد کی بار آوری نہیں کر سکتا۔
* شعور ایک یگانہ مرکزی وجود کی حیثیت میں رہتا ہے جسے ہم خودی یا شخصیت کہتے ہیں۔
* بالکل اسی طرح جیسے کہ حیات جو اپنی صفات کے لیے ایک وجود یا ایک مرکزی کشش کے طور پر زندہ رہتی ہے، صفات بھی امکانی حالت میں ذات کے اندر اسی طرح موجود رہتی ہیں۔
* بالفاظِ دیگر اگر خودی یا ذات "روح" ہے تو اس کی صفات موروثی طور پر اس کے اندر موجود ہوتی ہیں جیسے کہ اس کا "جسم"۔
* خودی یا شخصیت خواہ وہ آسمانی ہو یا انسانی، اپنی صفات کے ساتھ ایک وحدت میں لازم وملزوم کی حیثیت سے رہتے ہیں۔
* صفات ذات کو اپنے اظہار کے لیے مائل کرتی ہیں۔۔۔اور۔۔۔ذات ان کی چاہت سے قوت پا کر اپنی خوبصورتی اور اپنے امکانات کے مشاہدے اور انکشاف کے لیے اپنا اظہار کرتی ہے۔
* خود کو اس طرح اپنی صفات کے اندر منکشف کر کے خودی / ذات اپنی قوت اور آسودگی حاصل کرتی ہے اور جب منکشف ہوتی ہے تو اپنے باطن سے ذات کے لیے محبت اور کشش کی عکاسی کرتی ہے۔
* اس طرح تخلیق خالق کی ایک اندرونی خواہش ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ خود اپنے سحر اور اپنے حسن کا مشاہدہ کرتا ہے۔۔۔ مختلف النوع خوبیوں اور لامحدود امکانات کے تناظر میں۔

* دوسری جانب تخلیق جوں جوں نمو پاتی ہے، اپنے ماخذ ومنبع کی سمت بڑھتی ہے جو کہ اس کا خالق ہے اور جس کے اوصاف پہلے ہی سے تخلیق میں منعکس ہوتے ہیں۔
* یہ امر خودکار طرز پر تخلیق کے اندر یہ تقاضا پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے خالق کی جستجو کرے اور اس سے پیار کرے۔
* تخلیق اپنے تمامتر وجود کے لیے خالق کی مقروض ہوتی ہے۔ اس لیے اس کی حقیقی خوشیاں خالق کی جستجو میں سرگرداں رہنے اور اس سے محبت کرنے میں پنہاں ہوتی ہیں۔
* جو کچھ بھی تخلیق ہوتا ہے وہ خالق کی اپنی ذات کا اظہار ہوتا ہے۔
* دوسری طرف تخلیق بھی خالق کی خواہش کے نتیجے میں بن سنور کر وجود میں آتی ہے، جس میں خالق کی روح تیرتی ہے اور تخلیق کو زندگی بخشتی ہے۔۔وہ زندگی جس کا ارتکاز اپنے ماخذ یعنی خالق کی سمت ہوتا ہے۔

اور ان تمام حقائق کے مطابق وحدت الوجود کوئی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ خالق ومخلوق دو علیحدہ وجود رکھتے ہیں۔

ایک زندہ باشعور ذات، جو اپنے آپ میں ایک دنیا، اور اپنے خالق کا آئیڈیل ہوتی ہے، کبھی اپنی وحدت کو چھوڑ کر کسی بھی دوسرے وجود میں مدغم نہیں ہو سکتی۔
خود اپنی صفات کو اپنی تخلیق میں ایک حد تک ودیعت کر دینے سے نہ ہی خالق مخلوق کی سطح پر آ جاتا ہے نہ ہی مخلوق خالق کے درجے کو پہنچ سکتی ہے اور نہ ہی خالق اپنی صفات سے خالی یا عاری ہو جاتا ہے۔
کوئی بھی مصور ایک شہپارہ تخلیق کرتے وقت اس میں باہر سے کچھ نہیں داخل کرتا۔ وہ صرف اور صرف اپنی سوچ و فکر، اپنا تخیل، اپنا آئیڈیل اپنی صلاحیتوں اور خصوصیات کو ہی اپنی تخلیق میں منتقل کرتا ہے کیونکہ وہ اس شہپارے میں اپنے آئیڈیل کو نمود دیتا اور اپنے سحر اور حسن کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو کہ اس کائنات کا شعورِ مطلق ہے ایک مصور کی مانند بھی عمل پذیر ہوتا ہے اور خود کو فخر و انبساط کے ساتھ "الخالق الباری المصور" کے اسماءعالیہ سے موسوم فرماتا ہے۔ سبحان ربی العظیم۔

جدید علوم کی روشنی میں، اپنی محدود عقل و مطالعہ کی رو سے، یہ ایک پر خلوص کوشش ہے، انسانوں میں یکجہتی، تعاون اور سلامتی کے جذبے زندہ کرنے کی۔ احترامِ آدمیت ہی خدا اور رسول کا فرمان اور تلقین ہے۔ خدا ہمیں تلخ و ناگوار اظہار سے ہمیشہ بچائے۔ اس حقیر سی کاوش کو سندِ پسندیدگی ملے۔ اگرچہ محترم بھائی فاضل مصنف نے وسیع علمی تناظر کو متحرک کیا تھا، لیکن کوشش کی ہے کہ بات ایک محدود پیرائے ہی میں سمٹ جائے، کیونکہ موضوعات کی پنہائیاں خوفزدہ کرنے والی ہیں اور لامتناہی طور پر لکھنے کی گنجائش اور ضرورت فراہم کرتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ "گر قبولِ افتد، زہے عز و شرف"۔
والسلام۔ اللہ آپ سب پر اپنی بے پایاں رحمتیں نازل فرمائے۔

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

----

aurangzaib.yousufzai@gmail.com